رضوان اللہ

نشوز اور اس کا علاج

مردوں کی سربراہی کے تقاضے بیان ہو چکنے کے بعد اب اُن عورتوں کا معاملہ زیر بحث آیا ہے جو سربراہی کے اِن تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہوں اور ان کے رویوں میں اس قدر بگاڑ آ چکا ہو کہ خاندان کی اس چھوٹی سی ریاست میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہو۔ فرمایا ہے:

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ فَعِظُوۡھُنَّ وَاھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡھُنَّ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡھِنَّ سَبِیۡلًا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا. (النساء ۴: ۳۴)

''اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو اور ان کے بستروں پر انھیں تنہا چھوڑ دو اور انھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کا رویہ اختیار کر لیں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔''

یہاں شروع کلام میں، یعنی 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ' میں دو الفاظ خصوصاً قابل غور ہیں: پہلا لفظ 'نُشُوۡز' کا اور دوسرا 'تَخَافُوۡنَ' کا۔ 'نُشُوۡز' کے بارے میں معلوم ہے کہ اس سے عورت کی ہر طبعی و ذوقی حکم عدولی مراد نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مراد وہ نافرمانیاں ہوتی ہیں کہ جن کے نتیجے میں مرد کی سربراہی بذات خود زیر بحث آ جاتی، حتیٰ کہ اس کے ختم ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔[1] لہٰذا، بات بات پر جھگڑا اُٹھانے اور پھر اسی بنیاد پر عورت کا استحصال

---

[1] 'نُشُوۡز' کی اصل، اِرتفاع اور بلندی ہے اور مرد کے مقابل میں عورت کی سرکشی کے لیے اس کا استعمال عربی زبان میں حد درجہ معروف ہے۔ حوالے کے لیے ''لسان العرب'' اور ''مختار الصحاح'' کی مراجعت کی جا سکتی ہے۔

کرنے والوں سے یہ آیت متعلق ہے اور نہ اس میں ان کی موافقت کے لیے کچھ سامان ہی موجود ہے۔ دوسرا لفظ 'تَخَافُوْنَ' کا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ عورت کی اس سرکشی کے عملاً واقع ہو جانے اور اس کے نتیجے میں سب کچھ تلپٹ ہو جانے کا مرد انتظار نہ کرے، بلکہ جب عورت کے رویے میں سرکشی کی علامتیں اور بغاوت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوں، اسی وقت سے وہ توجہ دے اور اس سے نمٹنے کے لیے آیت زیر بحث میں بیان کردہ تدابیر کو اختیار کرے۔ یہ تدابیر جو تین کی تعداد میں بتائی گئی ہیں، ذیل میں ہم ان کا بیان ذرا تفصیل سے کرتے ہیں:

پہلی تدبیر

ہر اُلجھے ہوئے معاملے کو سلجھانے کی ابتدا چونکہ افہام و تفہیم سے ہوتی ہے، اس لیے نشوز کے حل کے لیے بھی پہلی اصلاح یہی تجویز ہوئی۔ ارشاد ہوا ہے: 'وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ' (جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو)۔ نصیحت کے لیے یہاں 'وَعْظ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ عربی زبان میں ایسی نصیحت کے لیے آتا ہے جس میں محض سمجھا دینا ہی نہیں، بلکہ اس میں معاملے کی سنگینی اور اس کے برے انجام کی آگہی دے دینا بھی پیش نظر ہوتا ہے[2]۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس لفظ کے مفہوم میں ایک طرح کی تنبیہ اور زجر کا عنصر بھی شامل ہے۔ سو 'فَعِظُوْهُنَّ' کے الفاظ مرد کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ عورت کی سرکشی پر اس کو تنبیہ کرے، اسے معاملے کی نوعیت اور اس کے نتائج سے خبردار کرے اور اگر کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنی پڑ جائے تو وہ بھی ضرور کرے کہ ایسا کرنا دراصل، 'فَعِظُوْهُنَّ' کی ہدایت ہی پر عمل کرنا ہوگا۔

دوسری تدبیر

'فَعِظُوْهُنَّ' کی تدبیر پر مرد نے خوب عمل کیا اور عورت کو اچھی خاصی نصیحت کی، مگر حاصل اس سے کچھ بھی نہ ہوا اور عورت کا سابقہ رویہ اسی طرح برقرار رہا تو اب یہ ہدایت ہوئی کہ وہ دوسری تدبیر پر عمل کرے۔ 'وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ'، یعنی اسے اس کے بستر پر تنہا چھوڑ دے۔ بستر پر تنہائی اصل میں ہم بستری نہ کرنے سے کنایہ ہے، اس لیے کہ محض بستر پر تنہا چھوڑ دینا، حکم کا منشا ہے اور نہ اس کا کچھ فائدہ ہے۔ تاہم یہ بات واضح رہے کہ مرد کو جنسی لاتعلقی

---

[2] یہی وجہ ہے کہ اہل لغت اس کا معنی بتاتے ہوئے 'النصح' کے ساتھ، بالعموم 'التذکیر بالعواقب' کے الفاظ بھی لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابن منظور ''لسان العرب'' میں۔

کی یہ ہدایت اس لیے نہیں دی گئی کہ وہ عورت کو زچ کرے یا اسے کسی اذیت میں مبتلا کر دے، بلکہ اس سے مقصود درحقیقت یہ ہے کہ عورت سے ناراضی کا اظہار کیا جائے اور اس کی سرکشی کو سہارا دینے میں جو اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد شے ہو سکتی ہے، اس کو ایک طرح سے زک پہنچائی جائے۔ یہ معلوم سچائی ہے کہ مرد کے مقابل میں عورت کا سب سے مجرب نسخہ اور سب سے کارگر ہتھیار، ہم بستری کی یہ حالت ہی ہے۔ یہ اسی کے برتے پر مرد کو تگنی کا ناچ نچا دے سکتی، اسے آغوش سے اٹھا کر اپنے قدموں میں گرا دے سکتی اور حدیث کے الفاظ میں اچھے خاصے دانا و بینا کی عقل کو بھی ماؤف کر کے رکھ دے سکتی ہے۔[3] 'وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ' کی ہدایت اس کے اسی غرور پر ایک طرح کی چوٹ ہے جو اسے یہ بات بھی باور کرا دیتی ہے کہ اس کا مرد اس معاملے میں کس قدر سنجیدہ ہے اور اس کی ہر عشوہ گری کی پروا کیے بغیر کس آخری حد تک وہ جا سکتا ہے۔

تیسری تدبیر

اگر کسی کی عورت ہٹ کی پکّی ہے اور اُس کی طبیعت ایسی ہے کہ سمجھانے کا کچھ اثر لیتی ہے اور نہ خلوتوں میں تنہا رہ جانے پر کسی طرح پسیجتی ہے تو ایسی صورت حال میں بھی خاندان کے ادارے کو قائم رکھنا اس قدر پیش نظر ہے کہ قرآن نے تیسری تدبیر کے طور پر اسے سزا تک دینے کی ہدایت کر دی ہے۔ فرمایا ہے: 'وَاضْرِبُوْهُنَّ'، یعنی مرد اپنی عورت کو سزا دے۔ سزا کی تعیین میں اصل حیثیت معلوم ہی ہے کہ سزا کے حکم کے مخاطب اور اس کے مقصد کو حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر باپ اور تھانیدار کو جب حق ضرب دیا جائے گا تو یہ آپ سے آپ متعین ہو جائے گا کہ باپ نے محض گوشمالی کرنی ہے اور تھانیدار نے خوب پٹائی کرنی ہے۔ چنانچہ 'وَاضْرِبُوْهُنَّ' میں جس سزا کا ذکر ہے، وہ کسی قسم کا تشدد نہیں، اس لیے کہ سزا کی یہ ہدایت شوہر کو ہو رہی ہے نہ کہ کسی ظالم جلاد کو، اور عورت کے نشوز کی علامتیں ختم کرنے کے لیے ہو رہی ہے نہ کہ خود اسے ختم کر دینے کو۔

مرد کو بحیثیت سربراہ کیا سزا دینے کا حق ہے بھی؟ اس بات پر کچھ عرصہ پہلے تک علما اور غیر علما، دونوں کو کوئی خاص اعتراض نہ تھا، مگر آج بہت سے حضرات اس سے انتہائی متوحش ہیں اور اس کو کسی بھی طرح مان کر دینے کو تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ اس حکم میں طرح طرح کی تاویلات پیدا کرتے اور اس پر نت نئے اعتراضات اٹھاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی تاویلات اور ان کے اعتراضات اور ان کی اصل حقیقت کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں:

---

[3] مسلم، رقم ۲۵۰۔

۱۔ کچھ صاحبان کا خیال ہے کہ 'وَاضۡرِبُوۡھُنَّ' اصل میں کسی سزا اور مار کا بیان ہے ہی نہیں۔ یہ تو عربی زبان کے ایک محاورے، یعنی ضرب مثل کا بیان ہے کہ جس کا مطلب کسی بات کو مثالوں کے ذریعے سے سمجھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو علما اس لفظ سے عورت کو سزا دینے کا جواز ثابت کرتے ہیں، وہ درحقیقت عربی زبان سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت فراہم کرتے اور قرآن کی منشا کے بالکل خلاف ایک عمل کرتے ہیں۔

اس تاویل پر ذیل کے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ ضرب مثل تو واقعتاً عربی زبان کا محاورہ ہے اور اس کا معنی بھی مثال بیان کرنا ہی ہے، مگر 'وَاضۡرِبُوۡھُنَّ' میں بھی 'ضَرَبَ' کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے، اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان میں اور خود قرآن مجید میں بھی اس محاورے کا استعمال بتاتا ہے کہ جب یہ مثالیں بیان کرنے کے معنی میں آئے تو ہمیشہ اپنے فعل کے لیے ایک مفعول اور اپنے متعلق کے لیے ایک صلے کا تقاضا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ کہف میں یہ اس طرح آیا ہے: 'وَاضۡرِبۡ لَھُمۡ مَّثَلًا'[۴]، یعنی آپ ان کے لیے ایک مثال بیان کیجیے۔ 'وَاضۡرِبُوۡھُنَّ' میں بھی جو حضرات اس کو اسی معنی میں لینا چاہیں، انھیں دو سوالوں کا جواب ضرور دینا ہوگا: ایک اس سوال کا کہ 'اِضۡرِبُوۡا' کا مفعول، یعنی 'مَثَلًا' یا پھر 'الأمثال'، وہ کہاں ہے؟ دوسرا یہ کہ 'اِضۡرِبُوۡا' کے متعلق، یعنی 'ھُنَّ' کے ساتھ 'ل' کا صلہ کیوں نہیں ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر معنی یہی ہے کہ ان عورتوں کو مثالوں سے سمجھاؤ تو پھر 'وَاضۡرِبُوۡھُنَّ' کے بجائے یہاں 'واضربوا لھن الامثال' کے الفاظ کیوں نہیں ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ 'اِضۡرِبُوۡا' کے مفعول کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ اس کا مفعول یہاں ہے تو سہی، مگر وہ لکھنے میں حذف ہو گیا ہے، تو اس پر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ وہ کون سا قرینہ ہے جو اس حذف پر آپ کی رہنمائی کر رہا ہے؟ کیونکہ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی قرینہ موجود ہونا تو دور کی بات، الٹا یہاں دو عدد قرینے اس بات کے پائے جاتے ہیں کہ یہاں امثال جیسا کوئی مفعول، کسی بھی صورت میں محذوف نہیں ہے: پہلا یہ کہ نصیحت کے عمل میں مثالوں سے بات کو سمجھانا شامل ہے، اس لیے 'فَعِظُوۡھُنَّ' کے بعد پھر اس کا بیان کر دینا بہرحال ایک حشو ہے اور قرآن کی شان سے یہ انتہائی فروتر ہے۔ دوسرا یہ کہ نشوز کے حل کے لیے تجویز کردہ ان تینوں تدابیر میں ایک ترتیب ہے جو اگر غور کیا جائے تو نرمی سے سختی کی طرف ہے، اس لیے نصیحت کرنے اور ہم بستری تک سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب اس سے سخت تر کسی عمل کی ہدایت تو ہوسکتی ہے، مگر پھر واپس نصیحت پر لوٹ آنے کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے۔

---

[۴] ۱۸:۳۲۔ سورۂ کہف ہی کی آیت ۴۵ میں اور یٰسٓ (۳۶) کی آیت ۱۳ میں بھی یہ اسی طرح آیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ کچھ حضرات کے ہاں 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کا معنی تو سزا دینا ہی ہے، مگر اس کا حق مرد کو نہیں، بلکہ جماعت کو یا دوسرے لفظوں میں، ملک کی عدالتوں کو حاصل ہے۔ اس کی پہلی دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ' میں مرد و زن، دونوں کا ذکر غیب کے اسلوب میں ہوا، مگر اس کے بعد 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' میں براہ راست معاشرے کو خطاب کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کی ہدایت بھی اصل میں معاشرے ہی سے متعلق ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس سے اگلی آیت میں 'وَاِنۡ خِفۡتُمۡ' کے جو الفاظ ہیں، کم و بیش سب علما کے ہاں ان کے ذریعے سے میاں بیوی کو نہیں، بلکہ معاشرے کی اجتماعیت ہی کو خطاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سزا دینے کا یہ حکم معاشرے ہی سے متعلق ہے۔[۵]

ان حضرات کی پہلی بات کے جواب میں عرض ہے کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ' میں مرد و زن کا ذکر غیب کے اسلوب میں کرنے کے بعد 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' میں مردوں سے جو براہ راست خطاب ہو گیا ہے تو اس کے دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: 'والّٰتی یخافون نشوزهن فلیعظوهن ولیهجروهن فی المضاجع ولیضربوهن'۔ اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی سلاست اس قدر ثقل اور سکتوں کی متحمل ہو نہیں سکتی تھی، اس لیے اس متوقع اسلوب کو لازماً بدلنا ہی تھا۔ دوسرا یہ کہ 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' سے پہلے تک مرد کی قوامیت، اس کے دلائل اور اس کے تقاضوں کا بیان ہو رہا تھا اور اپنے اندر تعلیم کا پہلو رکھنے کی وجہ سے ان کا غیب کے اسلوب میں آنا ہی زیادہ موزوں تھا، اس کے بعد جب بات تعلیم سے آگے بڑھ کر کچھ کچھ نزاعی ہو گئی کہ جس میں مرد کو کچھ تدبیریں تجویز ہونی ہیں تو ضروری تھا کہ اب اسلوب کو بدل دیا جاتا۔

ان کی دوسری بات کے جواب میں عرض ہے کہ قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ اپنے انداز بیان میں خطبے کی صنف سے زیادہ مشابہ ہے، اس لیے اس میں جس طرح خطاب کی نوعیت بدلتی ہے، اسی طرح مخاطب بھی بار بار بدلتا ہے۔ مزید یہ کہ کس جگہ کس سے خطاب کیا گیا ہے، اس کی واحد دلیل اس کلام کا سیاق اور خود خطاب کی نوعیت ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس آیت میں: 'وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡئًا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ'[۶]۔ اس

---

۵ دراں حالیکہ اس بات میں کیا فرق ہے کہ نشوز کی سزا شوہر دے یا پھر کسی ملک کی عدالت۔ ہر دو صورت میں عورت کو سزا دینے کی بات تو ماں ہی لینا پڑتی ہے۔

۶ البقرہ ۲: ۲۲۹۔ ''اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس لو، مگر اس

میں ہر کسی کے لیے یہ واضح ہے کہ 'وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ' اور اس کے بعد 'فَاِنْ خِفْتُمْ' کے الفاظ، اپنی ظاہری مشابہت کے باوجود، بالترتیب شوہر اور معاشرے ہی سے خطاب کر رہے ہیں۔ 'فَاِنْ خِفْتُمْ' میں معاشرے سے خطاب ہے، اس لیے کہ یہاں سے قانونی اور عدالتی کارروائی کا بیان ہو رہا ہے اور 'وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ' میں شوہروں سے خطاب ہے، اس لیے کہ مال بیویوں کو وہی دیا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح زیر بحث آیت میں بھی اگر سیاق اور نوعیت خطاب، دونوں پر نظر رہے تو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ 'وَاِنْ خِفْتُمْ' کے الفاظ میں جب یہ حکم دیا گیا کہ میاں بیوی کے خاندان میں سے ایک ایک حکم مقرر کیا جائے تو اس حکم کی نوعیت ہی نے واضح کر دیا کہ یہ الفاظ معاشرے ہی کو خطاب کر رہے ہیں۔ لیکن 'فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ' کی ایک ہی تسلسل میں بیان ہوئی ہدایات میں جب ہم بستری نہ کرنے کی ہدایت بھی ہوئی تو اس کی بھی نوعیت ہی نے واضح کر دیا کہ یہ تینوں ہدایات بہر حال شوہروں ہی سے متعلق ہیں۔ خطاب کی نوعیت کی یہ وضوح ہی ہے کہ بعض لوگوں کو مذکورہ رائے میں تغیر کرتے ہوئے یہ موقف اپنانا پڑا ہے کہ نصیحت کرنے اور ہم بستری نہ کرنے کی ہدایات شوہر ہی کو دی گئی ہیں، البتہ سزا دینے کی ہدایت صرف اور صرف اولی الامر کو ہے، دراں حالیکہ ایک ہی سیاق اور ایک ہی رو میں کہی ہوئی باتوں میں اس طرح کی تفریق کرنا اس وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے، جب قرآن مجید کو ایک فصیح اور بلیغ کلام کے بجائے چیستاں قسم کی کوئی چیز سمجھ لیا جائے۔

۳۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ عورت ذات کو مارنا، دراصل اس پر ظلم توڑنے کی ایک قدیم مردانہ روایت تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے اور کسی مہذب معاشرے میں اس کا تصور کر لینا بھی اب محال ہے۔ اور پھر یہ کہ عورت نکاح میں باقاعدہ فریق معاملہ ہے، اس لیے دوسرے فریق کا یہ حق تو ہے کہ وہ گفت وشنید سے بگڑے ہوئے مسائل کو حل کرے، مگر اسے یہ حق بالکل بھی نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرنے اور تشدد کرنے پر اتر آئے۔

اس کے جواب میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہییں: پہلی یہ کہ مرد کو حق ضرب دینا، یہ عورت پر کسی قسم کا ظلم ہے اور نہ قرآن مجید ہی کا یہ منشا ہے کہ کسی ذی روح پر، بالخصوص عورت کی ذات پر، ظلم روا رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ سزا دینے کی اس تدبیر پر عمل کرنے میں جن دشواریوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ سب آیت کا مدعا صحیح طور پر نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہماری ان باتوں کی تفصیل یہ ہے:

صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

اولاً، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ خاندان کا ادارہ اپنی حقیقت میں ایک ریاست سے مشابہ ہے اور ریاست کے بارے میں ہم سب مانتے ہیں کہ اگر اس میں بغاوت ہو جائے تو اس کو فرو کرنے کے لیے وہ اپنے شہریوں کو سزا دینے کا پورا پورا حق رکھتی ہے اور اس حق کو، ظاہر ہے وہ اپنے سربراہ کے ذریعے ہی سے استعمال کرتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خاندان کی چھوٹی سی ریاست میں بھی نشوز و بغاوت کی حالت پیدا ہو جائے اور شوہر کو بحیثیت سربراہ تادیب کا یہ حق دے دیا جائے تو اس میں آخر ظلم کیا ہے؟

ثانیاً، عورت جب اپنے آپ کو ایک مسلمان مرد کے عقد میں دیتی ہے تو وہ یہ فیصلہ اس شعور کے ساتھ کرتی ہے کہ اس کے شوہر کو بصورت نشوز اس کو سزا دینے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ بعد از نکاح اس پر اعتراض کرنا یا کسی دوسرے کا اس پر چیں بجبیں ہونا، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ثالثاً، یہ مار بھی، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک ہلکی مار ہے اور اسی سزا کی مثل ہے جو استاد اپنے شاگرد کو اور ایک باپ اپنی اولاد کو دیا کرتا ہے، اس لیے اس پر اتنا متوحش ہو جانا کہ اس کو ظلم کی صورت قرار دے دینا، ویسے بھی بہت عجیب ہے۔

رابعاً، مرد کو دیا جانے والا یہ حق ضرب، بیان کردہ تدابیر میں ترتیب کے لحاظ سے آخری جگہ پر ہے، اس لیے بہت سی صورتوں میں تو اس مار کی نوبت ہی نہ آئے گی اور نصیحت کرنے اور خلا ملا کے ترک کر دینے ہی سے بگڑی ہوئی بات بن جائے گی۔ چنانچہ اسی سزا کی بات کو لے اڑنا، اس پر واویلا کرنا اور اسے ظلم کی داستان تک کہہ ڈالنا بہر حال ایک طرح کا تجاوز یا پھر تجاہل ہی ہے۔

خامساً، 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کی ہدایت سے اصل مقصود سزا دینا ہے ہی نہیں، بلکہ عورت کے نشوز کی اصلاح کرنا ہے۔ سو کسی عورت کے احوال اگر یہ بتا دیں کہ اس کی اصلاح اس کے پٹنے ہی پر موقوف ہے کہ ہر انسان ایک سی طبیعت رکھتا ہے اور نہ کسی بات کا اثر قبول کرنے میں ایک جیسے رویوں کا اظہار کرتا ہے، تو حصول مقصد کے لیے اس تدبیر پر عمل کر لینے میں آخر کون سی رکاوٹ ہے؟ بالخصوص اس وقت کہ جب بہت سے معاشرے آج بھی اس بات کے گواہ ہوں کہ وہاں یہ تدبیر بڑی حد تک کارگر رہتی اور مطلوبہ نتائج کو بحسن وخوبی فراہم کرتی ہے۔

سادساً، جو حضرات عورت کو سزا دینے پر اس لیے معترض ہیں کہ کئی عورتیں اس سے مزید بگڑ جاتی اور کئی معاشروں میں ریاستی قوانین کی وجہ سے اس پر عمل کرنا ہی ناممکن ہوتا ہے، تو ان اہل علم کے سامنے ایک بات ضرور واضح رہنی چاہیے، وہ یہ کہ زیر بحث آیات میں صرف مردوں کی قوامیت کا بیان، درحقیقت شریعت کا بیان ہے۔ اس کے بعد جو تدبیریں تجویز کی گئی ہیں، وہ بذات خود کوئی شرعی قانون نہیں، بلکہ اس پر عمل کرنے کا طریقہ، یعنی پروسیجرل لا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

(Procedural Law) ہے۔ آسان لفظوں میں یہ کہ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، یہ بات شریعت ہے اور اس پر عمل کرنا انتہائی ضروری بھی ہے، مگر اس سربراہی کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے اور خاندان کو بچانے کی سب تدبیریں، اپنی حقیقت میں شریعت نہیں ہیں، اس لیے ان کو اختیار کرنا یا حسب حال اختیار کرنا، سو فیصد ہماری صواب دید پر منحصر ہے۔ چنانچہ جو عورت مار کھا کر مزید خراب ہوتی ہو یا پھر جن معاشروں کا رواج اس مار کی اجازت نہ دیتا ہو، وہاں یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ سزا کی اس تدبیر پر عمل کیا جائے، بلکہ نشوز کی اصلاح کے جو طریقے عورت اور معاشرے کے مناسب حال معلوم ہوں اور شریعت کی روشنی میں صحیح قرار پاتے ہوں، وہاں انھی پر عمل کیا جانا چاہیے۔ مزید یہ کہ اس معاملے میں قانون سازی کرنے، حتیٰ کہ سزا کی یہ تدبیر شوہر کے ہاتھ سے لے کر عدالت کو دے دینے کی بھی اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو تو اصلاح احوال کے لیے یہ سب بھی کر لینا چاہیے۔

رشتۂ نکاح کو بچانے کی اجتماعی تدبیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شوہر اپنی عورتوں کو نصیحت کریں، انھیں بستروں پر تنہا چھوڑ دیں یا پھر ان کی تادیب کریں، ان تینوں صورتوں کے دوران میں جس وقت بھی وہ آمادۂ اصلاح ہو جائیں تو اب شوہروں کو حکم ہے کہ 'فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا'، یعنی عورتیں اگر تمھاری اطاعت کا رویہ اختیار کر لیں تو اب ان پر کسی الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ اس کے بعد 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا' کے الفاظ ہیں جن میں مردوں کے لیے بڑی پرزور تنبیہ بھی ہے اور ایک طرح کی ترغیب بھی۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں اگر نشوز کو ترک کر دیں تو مردوں کو ان کے سابقہ رویے کی بنا پر یا پھر اپنی سربراہی کے زعم میں ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے، وگرنہ وہ یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی محدود درجے کی اس سربراہی کی کیا حیثیت ہے، اللہ تو ان سمیت، سب سے بلند اور بہت بڑی ذات ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس درجہ عظمت کے باوجود اپنے بندوں کی سرکشی سے درگذر کرتا اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، اس لیے انھیں بھی چاہیے کہ وہ بھی عفو و درگذر کا رویہ ہی اختیار کریں۔

لیکن اگر صورت حال یہ ہو کہ زیر بحث یہ تینوں تدبیریں مسئلے کو نہ سلجھا سکیں اور عورت کا نشوز اسی طرح برقرار رہے تو اب شوہر کا یہ حق نہیں کہ وہ ان سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کرے اور نہ عورت ہی پر یہ لازم ہے کہ وہ اس کے ساتھ چمٹ کر رہ جائے۔ تاہم خاندان کا ادارہ چونکہ انسانی معاشرے کی اساس ہے اور خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ جب ایک مرتبہ اس کو قائم کر لیا جائے تو حتی الامکان اسے ختم کرنے سے گریز کیا جائے، اس لیے آخری کوشش کے طور پر

اب اس نے معاشرے کی اجتماعیت کو حکم دیا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر معاملات کو درست کریں، کیونکہ نزاعی صورتوں میں معاملہ کے براہ راست فریق بسا اوقات بے جا خودداری اور ناروا قسم کی ضد میں مبتلا ہو جاتے اور اپنی بات سے ذرا بھر پیچھے ہٹ جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسے وقت میں اگر دوسرے لوگ، جو بالخصوص ان کے ہمدرد بھی ہوں، شریک معاملہ ہو جائیں تو فریقین میں مصالحت ہو جانے کا ایک واضح امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: 'وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا'* یعنی اگر تم لوگ میاں اور بیوی کے درمیان میں افتراق کا اندیشہ محسوس کرو تو ایک حَکَم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۔

رشتۂ نکاح کو بچانے کی اس آخری تدبیر میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ میاں اور بیوی، دونوں کے خاندان میں سے ایک ایک شخص کو مقرر کیا جائے۔ یہ اس لیے کہ خاندان کے لوگ ہی ان کے حقیقی ہمدرد اور خیر خواہ، ان کے گھریلو حالات سے صحیح طور پر واقف اور ان دونوں پر اپنے تعلق کی بنا پر ذاتی اثر و رسوخ رکھتے ہوں گے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اسی طرح کی چیزیں ہوتی ہیں جو مصالحتی عمل کو انگیز کر دیتی اور بالعموم، اسے نتیجہ خیز بنا دیا کرتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org

ان اشخاص کے لیے قرآن مجید نے 'حَکَم' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے بعض حضرات کو ایک اشکال پیش آ گیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مصالحت کا یہ عمل شاید ایک عدالتی کارروائی ہے اور 'حکمین' کی حیثیت ہر طرح کا فیصلہ کر دینے والے ایک قاضی کی سی ہے، حتیٰ کہ وہ فریقین میں اگر علیحدگی کا فیصلہ بھی سنا دیں تو ایسا کرنے کا انھیں حق حاصل ہے، دراں حالیکہ صرف 'حَکَم' کے لفظ سے یہ ساری بات اخذ کر لینا کسی بھی صورت صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس لفظ سے مراد محض فیصلہ کرنے والے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ فیصلہ عدالت میں ہو رہا ہے یا مصالحتی کمیٹی میں، یا پھر کسی پنچایت میں۔ یہاں اس سے مراد عدالت اور عدالتی فیصلہ کے بجائے پنچایت اور پنچایتی قسم کا فیصلہ ہی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اول تو حَکمین چونکہ مرد و عورت کے خاندان میں سے ہوں گے، اس لیے ظاہر ہے کہ معاشرے کے ہر مرد و عورت کا خاندان نہ عدالت ہے اور نہ عدالتی اختیارات ہی رکھتا ہے۔ دوم یہ کہ 'وَاِنْ خِفْتُمْ' میں معاشرے کی اجتماعیت سے، جو منظّم ہو جائے تو باقاعدہ ریاست اور پھر عدالت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، خطاب کیا گیا ہے اور انھیں یہ ہدایت ہوئی ہے کہ وہ حَکم مقرر کر دیں۔ چنانچہ جنھیں ریاست یا پھر عدالت مقرر کر رہی ہو، وہ بہر حال خود عدالت نہیں ہیں۔ تاہم یہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر عدالت ہی کسی کو حَکم مقرر کر دے اور اسے اپنے اختیارات بھی سونپ دے تو ایسا ہو جانے میں آخر کیا مانع ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس اِمکان کو مان لینے میں کوئی مانع نہیں ہے، مگر ضروری ہے کہ زیر بحث آیات میں اس کی کوئی دلیل بھی پائی جاتی ہو، حالاں کہ یہاں اس کے

* النساء ۴: ۳۵۔

برخلاف یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے پاس اس طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اور ان کی حیثیت صرف اور صرف مصالحت کے عمل کو نتیجہ خیز بنانے والے عاملین کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں 'اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا' کے الفاظ آئے ہیں جن کے ذریعے سے صلح کا ذکر تو کیا گیا ہے، مگر تفریق کا یہاں اشارہ تک نہیں ہے۔ اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے، اس لیے کہ علیحدگی کا فیصلہ اور اس کا حق شوہر یا بعض صورتوں میں عدالت کو تو حاصل ہے، ان کے سوا کسی اور کو اس بات کا حق بالکل بھی نہیں ہے۔

اس تدبیر کو بیان کر دینے کے بعد 'اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا' کے الفاظ میں فرمایا ہے کہ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ ان ''دونوں'' سے بعض لوگوں نے حکمین کو مراد لیا ہے اور بعض نے خود میاں اور بیوی کو، حالاں کہ حکمین کا اس معاملہ میں دخل دینا ہے ہی اصلاح کار کے لیے، اس لیے ان کو اس مقصد کے لیے مقرر کر دینے کے بعد پھر ان کے لیے یہ الفاظ لانا، موقع سے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے، البتہ ان کے تقرر کے بعد میاں اور بیوی کے بارے میں یہ الفاظ لانا، عین تقاضاے کلام ہے کہ معاملے کے اصل فریق یہی دونوں ہیں اور صلح کا واقع ہو جانا، اصل میں انھی کے ارادے اور نیتوں پر منحصر ہے۔ چنانچہ 'اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا' کے الفاظ میں میاں اور بیوی کو ابھارا ہے کہ اصلاح احوال کے اس آخری موقع کو وہ اپنے لیے غنیمت جانیں اور آپس کے اختلافات کو بھلا کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد 'یُوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا' میں فرمایا ہے کہ اگر وہ افتراق سے بچنے کے لیے اصلاح کا نیک ارادہ کر لیں گے تو اللہ کی عنایت خاص بھی ان کے شامل حال ہو جائے گی اور اس وقت جو اختلاف رونما ہو گیا ہے، وہ بتوفیق ایزدی پھر سے موافقت میں بدل جائے گا۔

آخر میں 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا' کے الفاظ ہیں جو ہر ذات، ہر بات، حتیٰ کہ ہر خیال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علیم اور خبیر ہونے کا بیان کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ اصلاح کے عمل میں شریک ہونے والے ہر شخص پر بڑا زبردست قسم کا پہرا بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہ سب اس شعور اور اس سوچ کے ساتھ اس نیک کام کو انجام دیں کہ ان کی کوئی حرکت اور کوئی نیت، اُس علیم و خبیر خدا سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com